صرف کرو اور اس کی اطاعت میں کوشش کرتے رہو۔ یہی تمام نیکی کے امور کا مجموعہ ہے اور یہی ساری بات کا مرکز ہے اور حنیفی بن جا۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مت بنا نہ شرک جلی کر نہ شرک خفی۔ نئی باتیں بنائی ہوئی بدعتیں ہیں ان سے پرہیز کر یہ گمراہی ہے۔ ان لوگوں کی طرف التفات نہ کر جو اپنے آپ کو تکلف سے فلسفہ دان بتاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے علم کے ہوتے ہوتے گمراہ کر دیا۔ اور ان کو ان کی سمجھ نے قید کر دیا تو یہ اس سے ہٹ نہیں سکتے۔

اب اگر تو تحقیق چاہتا ہے اور حکمت کے راز معلوم کرنا چاہتا ہے تو تجھے ہم بتاتے ہیں کہ ان کا علم اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ لیکن جو علم اطاعت کرنے اور قرب حاصل کے بعد منبع شریعت سے لیا جائے گا وہ علم ہوگا۔ میرے پیچھے آؤ میں تجھے سیدھے راستے سے لے جاؤں گا۔ اس بات سے پرہیز کرنا کہ ہمارے اس علم پر جس پر یہ کتاب خیر کثیر مشتمل ہے انکار کرے اور دنیا اور آخرت میں خرابی خریدے۔ اس لیے کہ یہ علم سچا ہے۔ ربانی ہے، اس کے آگے اور پیچھے گمراہی نہیں پیدا ہوتی۔ جس نے پارسی میں یہ شعر کہا ہے اسے بھی اللہ تعالیٰ اچھی جزا دے ؎

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است
سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جا است

اگر ہمارے بعض بڑے دوستوں کی مبالغہ والی کوشش نہ ہوتی تو ہم اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ متوسط درجہ کے لیے اس کے بیان سے گریز کریں لیکن خیر اس میں تھا جو اللہ منان نے کرا دیا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا وَّقَلْبًا وَّقَالَبًا وَّسِرًّا وَّعَلَانِيَةً

ترجمہ خیر کثیر پورا ہوا

مولانا غلام محمد گرامی

حَیَاتُ بَعْدَ المَمَاتْ

حکمتِ ولی اللٰہی
کی روشنی میں

حیات اور کائنات کے اسرار اور حقائق نہایت پیچیدہ اور لاینحل تصور کیے جاتے ہیں۔ سب مذاہب اور فلسفہ و حکمت کے سب مکاتبِ فکر اس مسئلے کے حل کرنے کے سلسلہ میں پریشان اور سرگرداں رہتے آئے ہیں۔

اور حیات بعد الممات کا مسئلہ بھی اس کائناتی معما کا ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کی عقدہ کشائی کے سلسلہ میں بھی جدید اور قدیم علماء اور مفکرین نے دل آویز اور ایمان افروز تاویلات اور تعبیرات کا ایک گنج گراں مایہ پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی تاریخ کے بنیادی عقائد اور تعلیمات میں حیات بعد الممات کو "اصولی اور ایمانی" حیثیت حاصل ہے۔

قرآن کریم کے نقطۂ نظر سے حیات، کائنات اور انسان تخلیق کے بامقصد شاہکار ہیں، اور ان کے باہمی تعلقات مشیتِ الٰہی اور حکمت بالغہ کے دائرۂ کار میں باہمی مربوط اور مستحکم ہیں۔ نیز یہ نظام حیات اور قیام کائنات لایعنی خرافات پر مشتمل نہیں ہے۔ یہ نظام ایک نصب العین اور عظیم مقصد کی تکمیل اور تحصیل کے سلسلہ میں ہر آن ارتقاپذیر ہے کُلَّ یَومٍ هُوَ فِی شَأْنٍ کا یہی مفہوم ہے ۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون
اقبالؔ

حیات بعد الممات کی تصویر جو موجودہ عقائد اور روایات کی حیثیت سے فقہی اور حدیثی ادب میں موجود ہے وہ قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے دل و دماغ کے لیے بڑی دلکش رہی ہے کیوں کہ قرونِ وسطیٰ کے علمی معیار میں اور اس ایٹمی، خلائی اور سائنسی دور کے معیاروں میں بڑا فرق اور بُعد ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں تحقیقی مسائل کے معیار کو عقلی اور فکری حیثیت سے مبادیات میں شمار کر سکتے ہیں اور "مقابلۃً" یہ دور منتہیات کا دور ہے۔ علم و فکر کے فروغ اور سائنسی اکتشافات نے علم اور معلومات کے پرانے ذخیرے کو بے روح اور بے مقصد بنا دیا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اہل اسلام نے بھی "اسرائیلیات" اور "عجمی روایات" سے جان چھڑانے کی کوشش بلیغ کی ہے، حتیٰ کہ "فقہ حدیث" کے صاحبوں نے فقہ اور عقائد کو عجمی خرافات سے کافی حد تک نجات دلائی ہے۔

گزارش یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی خرافات سے قرآن اور اس کے فلسفۂ حیات و کائنات کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

قرآنی طریقِ کار یہ ہے کہ مسائل کے افہام و تفہیم کے سلسلہ میں زیادہ تر امثال تشبیہ اور استعارہ سے کام لیا گیا ہے۔ قرآن کے مخاطب صاحب بصیرت اولو الالباب انسان ہیں۔ لہٰذا صاحب حکمت و بصیرت انسانوں کے لیے قرآن کا طریقِ خطاب ایمائی اور اشاراتی ہوتا ہے کیوں کہ ماورائے عقل مسائل کی کیفیت ایسی ہے کہ موجودہ دور کا انسان اس آب و گِل کے عالم میں رہتے ہوئے یہ مشکل ادراک کر سکتا ہے۔

کائنات کیا ہے؟ حیات کیا ہے؟ اور موت کی کیفیت کیا ہے؟ حیات مابعد کے ساتھ تعلق رکھنے والے معاملات، سزا اور جزا، عذاب اور ثواب، بہشت اور دوزخ وغیرہ کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ایسے مسائل ہیں جن کی ماہیت ابھی تک کلّی طور پر

مکشوف نہیں ہوتی۔

قرآنی امثال اور تشبیہات کے ذریعے سے جو منظر پیش کیا جاتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ صاحب عقل و بصیرت اور علم و فکر سے محروم ان دونوں کے فہم و فراست کے لیے تشفی اور اطمینان کا سامان ہو سکے۔ مختصر طور پر بتایا گیا ہے کہ حیات بے مقصد نہیں ہے اعمال ضائع نہیں ہوتے اچھے اچھی عاقبت کے مستحق ہیں اور بُرے سزا کے حقدار ہیں۔ یہ ہے وہ تاثر جو ان تشبیہات اور امثال سے پیدا کیا گیا ہے۔

ان تمثیلات کا اس مادّی زندگی سے ماخوذ ہونا ان کے قابلِ فہم ہونے کے لیے ضروری ہے۔ لہٰذا حیات مابعد کا نقشہ اور مرقعہ بھی اسی انداز سے کھینچا گیا ہے اور باور کرایا گیا ہے کہ

بہشت آن جا کہ آزارے نہ باشد

بہشت ایک آرام گاہ ہوگی جہاں باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، دودھ اور شہد کی نہریں، اور جہاں خوشگوار ماحول ہوگا۔ ان مادّی تشبیہات کے نام گنوانے کے بعد فوراً اس احتمال کو رفع کیا جاتا ہے کہ جنت کے باغ بالکل دنیوی باغوں جیسے نہیں ہوں گے۔ وہ اس دنیا کے باغات سے بالکل مختلف اور برعکس ہوں گے، وہاں ثمرات شیریں کی کثرت ہوگی مگر وہ ثمرات موسموں کے محتاج نہیں ہیں نیز ان کے گلنے سڑنے کا احتمال نہیں ہے۔ نہروں کا صاف اور شفاف پانی، شہد اور شیر، سب ذائقہ دار اور خوشبودار ہوں گے، مگر خراب ہونے کا امکان نہیں ہے۔ ان کا ذائقہ بالکل جدا ہے۔ وہاں کے احباب اور جلیس اس آب و گل کے پیکر اور مادی لباس میں نہیں ہوں گے بلکہ طاہر و مطہر لباس میں غیر مادّی اور روحانی ہیئت لیے ہوئے ہوں گے۔ وہاں کے باشندوں میں نہ کمزوری اور ضعیفی آئے گی اور نہ تو بیماری اور ہلاکت، وہ ہمیشہ تر و تازہ، جوان اور پُرشباب رہیں گے۔ ان کا کلام خرافات پر مشتمل نہ ہوگا بلکہ ذکر و فکر میں مشغول ہوں گے۔

اس سارے تشبیہی اور مثالی منظر کو ایک حدیثِ قدسی میں بیان کیا گیا ہے،

جن میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ ان "امثال اور تشبیہات" کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو وہاں بہشت میں حقیقت کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آسکتی۔

نیز صراحۃً فرمایا گیا کہ

"اپنے نیکو کار بندوں کے لیے اس نے ایک ایسی چیز تیار کی ہے جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا، کسی انسانی دماغ نے نہیں سوچا۔"

اسی طرح جنت کی نعمتوں کے برعکس وہ امثال بھی جو جہنم کی زندگی سے متعلق ہیں جسمانی اذیت اور عذاب کی واردات سے ماخوذ ہیں، اور ان کا منشا خطاکاروں کی عدم زندگی کے لیے بجز تنبیہ و ترہیب کے اور کچھ نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ "قرآن میں بیان شدہ نعائم اور ثمرات اور اس مادی دُنیا کے نعائم اور ثمرات میں بجز نام کے اور کچھ بھی مشابہت نہیں ہے۔

اس مختصر بحث سے واضح ہوتا ہے کہ حیات مابعد کا عالم مثالی ہے اور جنت اور دوزخ کے نعائم اور عذاب بھی سب تمثیلی ہیں۔ امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے اس موضوع پر کافی لکھا ہے۔

قرآن کی تمثیلات اور اشارات کے مفہوم کو ہم مان تو سکتے ہیں لیکن جان نہیں سکتے تاہم مختصراً یہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں کہ جنت اور جہنم کی ماہیت کچھ بھی ہو اس کا اعتراف کرنا ایمان کی شرط ہے اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مشیت الٰہی کے تکمیلی کاروبار، تکمیلِ کائنات اور تکمیل خلق کا، میں دونوں مقامات کی حیات اس مقصد کائنات اور منصب حیات کی تکمیل کا ذریعہ بنی ہے جو حق تعالیٰ اور مدبر الامور کے پیش نظر ہے اور جس میں خود مادی اور خاکی انسان تخلیقی ارتقاء کی ایک اہم منزل قرار پاتا ہے کیوں کہ یہ تو تسلیم شدہ حقیقت ہے بلکہ صوفیاء کرام اور فقہائے عظام کے یہاں امر واضح ہے کہ دوزخ اور جنت خواہ روح کی کیفیات ہوں یا کچھ اور، وہاں بھی ہمیشہ ایک ہی حالت پر قائم نہیں رہ سکتے کیوں کہ تغیر اور ارتقاء کے بغیر مقصدِ تخلیق میں جمود پیدا ہوجائے گا

اور منشائے تخلیق میں جمود کے ساتھ ساتھ انقطاع، زوال، التواء اور برہمی کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے بھی اس امر کی وضاحت کی ہے کہ حیات مابعد میں انسان کے لیے جمود اور استقرار نہیں ہے، ایک تغیر اور ارتقاء کا لامتناہی سلسلہ ہے۔

قرآن نے بھی اس حقیقت کو نہایت بلیغ اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے:

"لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۔ یعنی تمھیں ایک (منازل ہست و بود کو) درجہ بدرجہ ایک پست اور خسیس حالت سے ارفع حالت کی طرف مسلسل لے لیا جائے گا"

اس مختصر ترین آیت میں تغیر اور ارتقاء کی یقین دہانی موجود ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وہ وعدہ ہے کہ جو نیک و بد دونوں سے یکساں طور پر کیا گیا ہے لیکن اس وعدے کی تکمیل کس طرح ہوگی؟

شاہ ولی اللہؒ جو اس دور کے عظیم حکیم اور آیۃ من آیات اللہ ہیں۔ اس دقیق اور عمیق مسئلہ کے حل کرنے میں باتی لطف اور اجماع سے مقام تفرید پر فائز ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق ہے کہ

"قرآن بار بار اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ اس عالم آب و گل سے نیکوکار اور بدکردار دونوں قسم کے انسان موت کے بعد اپنے دنیوی اعمال کے "اثرات" نسمہ کے واسطے سے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ان کے اعمال نسمہ کے واسطے سے ان کی روحوں پر ناقابل محو طریقے سے مرتسم ہوں گے۔ انسان کا عمل، اس کا ارادہ، اس کا نظریہ، اس کا عقیدہ، اس کا خیال، اس کی نیت، اس کا کلام، اس کا احساس، اس کے تصورات، یہی نہیں بلکہ اس کے توہمات بھی نسمہ کے واسطے سے، اس کی گردن سے مضبوطی کے ساتھ چپٹے ہوئے رہیں گے یہ سب انسان کی اس زندگی پر شاہدی دیں گے جو زندگی انسان

نے اس عالم رنگ و بو میں بسر کی تھی۔"

یہ تھے سب نیاب شاہ ولی اللہ کی اس منفرد تحقیق کا ... کے دلائل مفصلاً حجۃ اللہ البالغہ میں موجود ہیں۔

قرآن کریم کہتا ہے:

"وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا ۝ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۝" (بنی اسرائیل آیت ۱۳، ۱۴)

یعنی "ہم نے ہر شخص کے نامۂ اعمال کو اس کے گلے میں اٹکا رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اسے کتاب کی شکل میں اس کے واسطے نکال کر سامنے لائیں گے، وہ اسے کھلا ہوا پائے گا۔ (اور کہا جائے گا کہ) اپنا نامۂ اعمال پڑھ۔ آج تو اپنے اعمال کے حساب کے لیے خود ہی کافی ہے۔"

واضح ہوا کہ عالم آخرت کے مخصوص ماحول اور اس مخصوص ماحول کے مختلف الحال طریقوں کے مطابق ہر نیک و بد کو اپنے کردار کے حسن و قبح کا مشاہدہ کرنا ہوگا جو کردار اس نے عہد ماضی کے دائرہ آب و گل میں ادا کیا تھا لیکن تمرد، تکبر، تساہل، اغماض، بدنظری، غفلت، کج فہمی اور کج نظری سے اس نے اللہ کی ان نشانیوں سے غدار و گردانی کی اور اپنی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور نہ اپنی اصلاح کی اور نہ تو تلافی، توبہ اور رجوع کی کوشش کی۔ حالانکہ اس کے پاس حیات کا ایک حصہ باقی اور بھی تھا، صحت بھی تھی، گنجائش بھی تھی، موقع بھی تھا کہ وہ توبہ اور استغفار کر سکتے۔ نیز اس نے ان فطری توانائی، قوتوں کے توازن، مزاج کے اعتدال، ضمیر کی سرزنش اور دعوت تمیز پر بھی دھیان نہ کیا تھا۔ نیز صلاحیتیں اس کی سرشت میں ودیعت دی گئی تھیں ان کے استعمال سے کنارہ کشی بھی کر سکتا تھا۔ افسوس یہ ہے موت کے بعد وہ ان قوتوں کے استعمال سے یکسر محروم ہوگیا۔ لہذا موت کے دائرے میں اس کی گزشتہ زندگی کا ایک

ایک لمحہ ان کے سامنے لایا جائے گا اور اس کی حیات کی یہ مکمل تصویر ۔۔۔ ہیئت میں لائی جائے گی جیسی کسی بوڑھے فلمی فنکار کے سامنے اس کی جوانی کی پکچر لائی جائے اور وہ دیکھ کر حیرت میں غرق ہو جائے ۔ کیوں کہ اس نے رکی اور بھی بہت ساری فلمیں تیار شدہ تھیں لہٰذا اوائل دور کی فلم اس کے حافظے سے یقیناً محو ہو چکی ہو گی جسے دوبارہ دیکھ کر انکار نہیں کر سکتا کہ یہ نقل و حرکت کرنے والا میں نہیں ہوں

مسئلہ یہ ہے کہ اس طرح کی فلم جب سامنے آجائے گی تب نئی تشکیل حیات کے فلمی پردہ پر وہ انسان یا تو خوشی کے ساتھ اپنے ماضی کے کردار کا مشاہدہ کرے گا یا کرب و اضطراب ، ندامت اور پریشانی کے عالم میں انگشت بہ دندان رہ جائے گا۔ بہر نوع انکار نہ کر سکے گا یہ کرداری تصویر نہ ناقابل تردید ہے۔ قرآن نے اس کیفیت کی تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ

"انسان کے جوارح اور اعضاء خود شاہدی پیش کریں گے کہ انھوں نے دنیا کے رنگ و بو میں کیا کیا تھا"

شاہ ولی اللہؒ نے حیات بعد الممات کے مشکل عقدے کو حل کرنے کے سلسلہ میں اپنے حکیمانہ انداز سے سب سے پہلے روح کی حقیقت پر گفتگو کی ہے اور روح کے متعلق قدیم اور جدید نظریات پر تنقید کی ہے اور قرآن کریم کے نظریۂ روح کو سمجھنے کے لیے علمی اور تحقیقی انداز میں تشریح کی ہے۔ روح کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں کہ (اے محمدؐ) لوگ تم سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں تو کہہ دو کہ روح اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے اور تم کو (اس بارے میں) تھوڑا سا علم دیا گیا۔ اعمش نے بروایت ابن مسعودؓ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ کی جگہ وَمَآ اُوْتُوْا پڑھا ہے (بصیغۂ غائب) جس کے یہ معنی ہوئے کہ "ان کو تھوڑا سا علم دیا گیا ہے" پس یہاں سے صاف معلوم ہو گیا کہ یہ کلام ان یہودیوں

کے مقابلہ میں ہے جو آپ سے حقیقت روح دریافت کرتے تھے"۔

ایک غلطی کا ازالہ

بطور جملہ معترضہ گزارش ہے کہ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس آیت کریمہ کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت روح کا علم قلیل دیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اس غلط بینی پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"اس آیت سے صاف طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ امت مرحومہ میں سے کسی کو روح کی حقیقت معلوم ہی نہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس چیز کے بیان سے شارع نے سکوت فرمایا ہے اس کا علم کسی کو ممکن ہی نہ ہو۔ بلکہ بسا اوقات بعض چیزوں کے بیان سے اس لیے سکوت اختیار کیا گیا ہے کہ وہ دقیق الفہم ہیں، ہر شخص ان مسائل کو سمجھ نہیں سکے گا چاہے دو چار ہی ان کو سمجھ سکتے ہوں۔

حقیقت روح

اس کے بعد روح کی تعریف کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو خالص اور صالح اخلاط (مرکبات جسمانی مثلاً خون، بلغم، سودا، صفرا) قلب میں پیدا ہوتے ہیں اور قوائے حساسہ و متحرکہ و مدبرۂ غذا بدن کو اٹھائے پھرتے ہیں اور ان میں طب کا حکم چلتا ہے۔ اور تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بخارات کا رقیق (پتلا) اور غلیظ (گاڑھا) صاف اور مکدر ہونا ان قویٰ پر اور جو افعال ان قویٰ سے پیدا ہوتے ہیں ان پر ایک خاص اثر ڈالتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی عضو پر یا ان بخارات کی پیدائش اور بناوٹ پر جو اس عضو سے قائم

مناسبت رکھتے ہیں، کوئی آفت آجاتی ہے تو وہ ان بخارات میں بگاڑ اور ان کے افعال میں گڑبڑ پیدا کر دیتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بخارات کا پیدا ہونا حیات کا اور تحلیل ہونا موت کا باعث ہوتا ہے۔ بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے روح یہی بخارات ہیں۔ لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بخارات تو روح کا ادنیٰ طبقہ ہیں اور ان کو بدن سے وہ نسبت ہے جو بُو کو گل سے یا آگ کو کوئلہ سے ہوتی ہے۔ پھر ذرا اور غور کیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بخارات نہیں بلکہ "روحِ حقیقی" کا مرکب اور اس کے (بدن سے) متعلق ہونے کا مادہ ہے۔"

اس کے بعد شاہ صاحب روحِ حقیقی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ثابت ہوا کہ جس چیز سے انسان زندہ اور قائم رہتا ہے وہ یہ روح (یعنی بخارات) نہیں اور نہ ہی یہ بدن ہے اور نہ وہ مشخصات ہیں جو بادی النظر میں دکھائی دیتی ہیں بلکہ روح حقیقی ایک منفرد اور جداگانہ چیز ہے اور ایک ایسا نکتہ نورانی ہے جو ان احوالِ متغیرہ اور اطوار متبدلہ سے جو بعض جواہر اور بعض اعراض ہیں بالکل الگ ہے اور یہ روح حقیقی جس طرح چھوٹے (جاندار) میں ہے اسی طرح بڑے میں بھی ہے۔ اور جس طرح سیاہ میں ہے اسی طرح سے سفید میں بھی ہے اور ایسے دیگر تمام متماثل ہوئے اضداد میں یہ بلاتفاوت موجود ہوتی ہے اور اس حقیقی روح کا اصلی علاقہ اور تعلق تو بخارات ہی کے ساتھ ہے اور انھی کی وجہ سے بدن سے بھی ہے۔"

شاہ ولی اللہؒ کی یہ تشریح علمی اور فنی حیثیت سے نہایت مدلل اور قابلِ قبول ہے۔ اس عہد بعد کے مادیین بھی قریب قریب روح کی اس تشریح سے جزوی اختلافات

کے ساتھ متفق ہیں۔

جدید مادیین کا کہنا ہے کہ انسانی مشین کے عناصر اربعہ کے مرکب سے جو حرارت اور حدت پیدا ہوتی ہے وہی رُوح ہے اور اس حدت اور حرارت کو بخارات بھی کہا گیا ہے۔ شاہ صاحب بھی بخارات سے تعبیر کرتے ہیں مگر ان کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "رُوح حقیقی ایک منفرد اور جداگانہ چیز ہے اور ایک نکتہ نورانی ہے" شاہ صاحب کی یہ تعریف فلسفیانہ اور حکیمانہ ہے، لہذا اس کا ادراک بجز صوفیائے کرام کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔

رُوح ہوائی

شاہ صاحب نے جدید مادیین کی تعریف کو تسلیم نہیں کیا اور ان کی تحقیق یہ ہے کہ "رُوحِ حقیقی" کے علاوہ "رُوحِ ہوائی" بھی ہے۔ شاہ صاحب اس رُوح ہوائی کو نسمہ کہتے ہیں

شاہ صاحب فرماتے ہیں :

"حقیقی رُوح کا اصلی علاقہ اور تعلق تو "بخارات" ہی کے ساتھ ہے اور انھی کی وجہ سے بدن سے بھی ہے کیوں کہ بدن تو نسمہ کا (یعنی بخارات کا) جن کو رُوح ہوائی کہتے ہیں) مرکب ہے اور یہ رُوح حقیقی عالمِ قدس کی ایک ایسی کھڑکی ہے۔ کہ جن جن چیزوں کی رُوح ہوائی کو قابلیت اور استعداد ہوتی ہے وہ سب اسی راہ سے اس پر اترتی ہیں۔"

موت

شاہ صاحب کی تحقیق ہے کہ موت بھی روح ہوائی پر وارد ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"اب رہے یہ تغیرات تو یہ سب اسباب ارضیہ کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ دیکھو آفتاب کی دھوپ اور گرمی سے کپڑے تو سفید ہو جاتے ہیں لیکن دھوبی کو سیاہ کر دیتی ہے۔"

اس مختصر تمہید کے بعد موت کے متعلق فرماتے ہیں:

"ہم کو اپنے وجدان صحیح سے یہ بھی معلوم و متحقق ہوگیا ہے کہ
بدن میں جب روح طواف کے پیدا ہونے کی استعداد نہیں رہتی،
تب روح ہوائی وہاں سے الگ ہوجاتی ہے اور اسی کا نام "موت"
ہے"

اس سے واضح ہوا کہ شاہ صاحب روح کی کیفیت کو وجدانی طور پر محسوس کرچکے ہیں۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ "موت" فقط روح ہوائی کے لیے ہے۔

نسمہ کی حقیقت

نسمہ یعنی روح ہوائی کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ایک اور انداز سے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"نسمہ (روح ہوائی) میں بھی ایک راز یا جوہر ہے اور اس کی
ایک خاص مقررہ حد اور اندازہ ہے جس سے تجاوز نہیں ہوسکتا
اور جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کی روح ہوائی کی اور ہی صورت
پیدا ہوجاتی ہے"

شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ روح ہوائی کی عالم مثال میں ایک اور ہی حقیقت بن جاتی ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"روح حقیقی کی وجہ سے (موت کے بعد) اس کی حس مشترک میں
سے جو کچھ باقی تھا اس میں ایک ایسی قوت پیدا ہوتی ہے جو عالم مثال
کی مدد سے قوت گویائی و شنوائی و بینائی کا کام دیتی ہے یعنی اس کو
ایک ایسی قوت ملتی ہے جو محسوسات و مجردات کے بین بین ہوتی
ہے۔ بسا اوقات روح ہوائی کو عالم مثال کے ذریعے سے لباس نورانی
یا ظلمانی کی قابلیت اور استعداد پیدا ہوجاتی ہے"

ایک اور علمی تشریح | شاہ صاحبؒ نے اس نکتہ کو ایک اور حکیمانہ طریقے سے بھی سمجھایا